ایمان کی حقیقت

اقرار باللّسان

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ

اشیا کے وجود کی تین صورتیں

کسی چیز کے وجود کی عالم میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں: ۱- لفظی۔ ۲- ذہنی۔ ۳- عینی۔

ان ہر سہ اصناف میں لفظی وجود سب سے ضعیف اور کمزور وجود ہے۔ جو مقاصد و اغراض کسی شے کے وجود میں ملحوظ ہو سکتے ہیں' ان میں سے کوئی بھی اس وجود پر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر اس وجود کو عدم کے برابر کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہے۔ پانی کا لفظی وجود کسی تشنہ کی پیاس نہیں بجھاتا' اور نہ روٹی کا صرف زبانی تذکرہ کسی بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے۔

وجودِ ذہنی گو لفظی وجود سے قوی تر ہے' مگر شے کے تمام آثار و احکام مرتب ہونے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔

وجودِ عینی وہ وجود ہے جو خارج میں کسی کے اعتبار کیے بغیر موجود ہوتا ہے۔ اسی وجود کو درحقیقت وجود کہا جا سکتا ہے۔ بقیہ اصناف اس کے توابع اور فروع ہیں۔ یہی مبدءِ آثار ہے' اور اسی پر شے کے سب احکام مرتب ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی تر و تازگی' قلب و جگر کی سیرابی' اشجار و اثمار کی سرسبزی' یہ سب پانی کے وجودِ عینی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی لیے جب کوئی پیاسا پانی مانگتا ہے تو اس کا مقصد پانی کا یہی عینی وجود سمجھا جاتا ہے' اور اس کا لفظی یا ذہنی وجود کسی کے خواب و خیال میں نہیں آتا۔

اسی طرح ایمان کے وجود کی بھی تین صورتیں ہیں: لفظی' ذہنی' عینی۔

ایمان کا وجودِ لفظی

سابق تمہید کی بنا پر ایمان کا لفظی وجود بیکارِ محض ہونا چاہیے۔ جب کسی تشنہ کے لیے پانی کا

صرف لفظی وجود کار آمد نہیں ہوتا تو' انبیا علیہم السلام کی دعوت کے جواب میں' ایمان کا صرف لفظی وجود کیا مفید ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک سخت مشکل یہ درپیش ہے کہ عالمِ بشریت کی سرتا سر محتاجی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنائے بغیر ادا کر سکے۔ اس کی قلبی ترجمانی کا یہی ایک ناتمام آلہ ہے۔ اگر وہ بھی ناقابلِ اعتبار ٹھہرے' تو عالمِ انسانی کا تمام کاروبار معطل اور بیکارِ محض ہو جائے۔ اس لیے چاروناچار ایمان کا لفظی وجود بھی شریعت میں ایک حد تک قابلِ اعتبار سمجھا گیا ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ۔

میں اس بات پر مامور ہوں کہ جب تک کفار لا الہ الا اللہ نہ کہیں' ان سے جنگ جاری رکھوں۔

اب اسے ایمان کی رفعت اور بلندی کہیے' یا اس کی فیاضی سے تعبیر کیجیے' کہ محض زبانی کلمۂ توحید پر اس نے جان بخشی کا اعلان کر دیا ہے اور کسی کے دل کے اندر کی کیفیت سے کوئی بحث نہیں کی۔[۱]

اس جگہ یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ اسلام میں تصدیقِ قلبی کے بغیر' صرف زبانی اقرار کر لینا بھی کوئی وزن رکھتا ہے' کیونکہ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی' کسی حالت میں' قطعِ نظر کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ حتیٰ کہ' بحالتِ اکراہ جبکہ اپنی جان پر بن رہی ہو' زبان سے کلمۂ کفر ادا کرنے کی صرف اسی شرط سے اجازت دے دی گئی ہے کہ قلب کی گہرائیاں اذعان و ایقان سے لبریز اور معمور رہیں۔

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (النحل ۱۶:۱۰۶)

مگر وہ شخص جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہے۔

جو صورت حدیث میں مذکور ہے' وہ یہ ہے کہ اگر زبان اقرار کر لیتی ہے' اور دوسری کوئی دلیل' جو قلبی انحراف پر دلالت کر سکے' ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی' تو اس وقت ہم اس بات کے مامور ہیں کہ اس اقرار ہی کو قلبی تصدیق کی دلیل سمجھیں۔

اسلام' جو اخلاقِ عالیہ کا سب سے اوّل معلم ہے' کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان کو بلا وجہ جھوٹا قرار دے' یا اس کے متعلق' کسی اندرونی کمزوری کی بنا پر' اپنے ضمیر کے خلاف بولنے کا تصور لائے۔ دنیا میں ایک بڑے سے بڑا انسان' خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام تک کیوں نہ پہنچ چکا ہو' کبھی اپنے حریف پر' وہ بھی بحالتِ جنگ' اعتماد کا خیال نہیں

کر سکتا۔ یہ اسلام ہے' جو یہ دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اعتماد کرلو' اور اس تشویش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ اگر ان میں کوئی سعید روح ہوگی' تو ایک دن وہ خود بخود اپنے اس صدق نما کذب پر نادم ہوگی' اور دل بھی زبان کی طرح اسلام کا کلمہ پڑھ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے ایک کافر کو بکریاں چراتے دیکھا۔ دورانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کی گھات میں لگا ہی رہتا ہے۔ صحابہؓ نے ارادہ کیا کہ اس کی بکریاں چھین لیں۔ اس نے اپنا پانسا کمزور دیکھا۔ وہ وقت آگیا کہ جو اسلام مدت سے اس کے سینہ میں گھوم رہا تھا اب دل میں اتر آئے۔ وہ اسلام لے آیا۔ مگر اس حال میں دشمن کا اقرارِ وفاداری' انسان کی کمزور فطرت کب قبول کرتی۔ اس لیے صحابہ کرامؓ نے اس اسلام کو صرف مال کے بچاؤ کا ایک ذریعہ سمجھا' اور اس کی بکریاں غنیمت کا مال بنا لی گئیں۔ لیکن اسلام' جو اخلاق کی آخری منازل صرف زبانی سکھانے نہیں آیا تھا بلکہ طے کرانے آیا تھا' اس کمزوری کو کب برداشت کرتا۔ اس واقعہ کی اہمیت محسوس کی گئی' اور اتنی کی گئی کہ وحی الٰہی کو دخل دینا پڑا' اور نہایت تنبیہہ آمیز لہجہ میں ارشاد ہوا :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (النساء ۴ : ۹۴)

اور مت کہو اس شخص کو' جو تم سے "سلام علیک" کرے' کہ تو مسلمان نہیں۔ تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا۔

کتبِ احادیث میں اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں' بہت ہیں' جہاں اسلام کے لفظی وجود' یعنی صرف اقرار باللسان کو دنیوی احکام کے لیے کافی سمجھا گیا ہے۔

حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ" اگر دورانِ جنگ میں دشمن میرا ایک بازو کاٹ دے' اور جب میرا موقعہ لگے تو وہ جان بچا کر درخت کی آڑ میں آجائے' اور کلمۂ شہادت پڑھ لے' تو کیا میں اس کے اس جرمانہ اقدام کے بعد بھی اس کا یہ متہم اسلام قبول کرلوں ؟ ارشاد ہوا' ضرور۔ اور اگر اس کے بعد بھی تم نے اسے قتل کردیا' تو یاد رکھنا' تم اب اسی طرح مباح الدم سمجھے جاؤ گے جیسا وہ اپنے اسلام لانے سے قبل مباح الدم تھا (مسلم شریف)۔

دیکھو' یہاں بھی انسان کی کمزور فطرت کس طرح اپنے حریف کا اسلام متہم کررہی ہے' اور چاہتی ہے کہ اس کے انتقام میں یہ لفظی اسلام حائل نہ ہونے پائے۔ مگر یہ اسلام ہے' جو اپنے

ہمنواؤں کے سیکڑوں بازو حریفوں کی ایک زبان پر نثار کر رہا ہے۔ انتقام گو فطری حق سہی، مگر اسلام اس نازک ماحول میں یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ ایک کلمۂ حق کے احیا میں وہ اپنے فطری اور ذاتی حق سے بھی دست بردار ہو سکتا ہے۔

اقرارِ وفاداری

احادیث میں کچھ واقعات ایسے بھی نظر سے گزرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دشمنوں کی جان و مال کا تکفل اور ان کی عزت و احترام کا تحفظ، کچھ خاص اس کلمہ کے ادا کرنے ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ صرف اقرارِ وفاداری کی ضرورت ہے، خواہ کسی زبان سے ہو اور خواہ کسی عمل سے۔

حضرت خالدؓ مسلمانوں کا ایک دستہ لیے ہوئے مصروفِ جہاد ہیں۔ دشمن چاہتا تھا کہ اسلام قبول کر لے، مگر ناواقفی اور جہالت کی وجہ سے اسلمنا (ہم نے اسلام قبول کیا) کا لفظ نہ کہہ سکا، اور اس کے بجائے صبانا صبانا (یہ لفظ عربی زبان میں بددین ہونے کے لیے مستعمل ہے) کی صدا بلند کرنے لگا۔ اسی کمزوریِ فطرت کی وجہ سے یہاں بھی یہ نازک اسلام قبول نہ ہوا، اور آخر اسی حالت میں سب کو موت کا جام پی لینا پڑا۔ رحمۃ اللعالمینؐ کو جب اطلاع ملی تو انتہا درجہ مضطرب ہوئے، اور اسی اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھ اس تصور میں آسمان کی طرف اٹھ گئے کہ مبادا اللہ تعالیٰ کا قہر ان معصوموں کا انتقام لینے کے لیے کھڑا ہو جائے، اور میں بھی اس میں شامل سمجھا جاؤں۔ اس لیے فرمایا، اے پروردگار، جو غلطی خالد سے سرزد ہوئی، میں اس سے بری ہوں (بخاری)۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ لفظی وجود گو ضعیف تر بلکہ مرادفِ عدم ہے، پھر اسلام نے اس کا کیوں اعتبار کر لیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اقرار سے مراد یہاں وہی اقرار ہے جسے ضمیر کی صحیح آواز کہا جا سکے۔ ورنہ اسے اقرار ہی نہ کہا جائے گا، بلکہ وہ انکار کی صرف ایک اقرار نما صورت ہوگی۔ اسلام کے اس لفظی وجود کو فقہا کی اصطلاح میں اقرار باللّسان کہا جاتا ہے۔

اقرار باللّسان

فقہا کو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا رکھنا چاہیے۔ ایک جماعت رکن کی حیثیت تجویز کرتی ہے، اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک نوع کی تصدیق ہی کا نام ہے۔ فرق ہے تو یہ کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے، اور اقرار، زبان کی تصدیق ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن

اور دوسری شرط قرار دے دی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ تصدیقِ قلبی رکنِ اصلی ہے' یعنی کسی حالت میں یہاں تساہل برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اور اقرار' رکنِ زائد' یعنی بعض صورتوں میں یہاں اغماض و چشم پوشی کرلینا بھی ممکن ہے' جیسا کہ اکراہ میں۔

شیخ ابو منصور ماتریدی' شیخ ابوالحسن اشعری' اور امام نسفی کا میلانِ خاطر اقرار کی شرطیت کی طرف ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوتِ اسلام سے قبل ہی احکامِ اسلام کا نافذ کردینا تو غیر معقول ہے' اور زبانی اقرار کیے بغیر ہمارے پاس اسلام پر کوئی شہادت نہیں۔ اس لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ نفاذِ احکامِ اسلامیہ کے لیے اقرار باللسان کو شرط کہا جائے۔

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ اگر اس اقرار کا صرف یہ مقصد ہے' تو تنہائی کا اقرار کافی نہ ہونا چاہیے' بلکہ کم از کم مسلمانوں کے امیر کے سامنے ہونا چاہیے' تاکہ اجرائِ احکام کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ اس امر پر فریقین کا اتفاق ہے کہ مطالبہ کے بعد زبان سے اقرار کرنا بہرکیف ضروری ہے' کیونکہ اب اقرار نہ کرنے کے معنی گویا انکار کرنا ہیں۔ یہ کفرِ جحود کہلاتا ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ (النمل ۲۷ : ۱۴)

اور انکار کیا ان (آیات) کا' حالانکہ اپنے دل میں اس کا یقین کر چکے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کبھی دل اندر سے یقین کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے' مگر زبان انکار سے باز نہیں آتی۔ اس کا نام اصطلاح میں کفرِ عناد ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے تھے کہ ہمارے فقہا نے ایمان کی تعریف میں اسی لیے اقرار کا اضافہ کردیا ہے کہ جو تصدیقِ قلبی زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہ رہے' اور یہ سمجھا ہے کہ جب زبان کے لیے اقرار کرنا لازم ہو جائے گا' تو اب انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔

حافظ ابنِ تیمیہؒ نے اس کو دوسری طرح ادا کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ' جب تک اقرار نہ ہو' ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے قلب میں حقیقتہً تصدیق موجود ہے۔ لہٰذا اگر ایک شخص مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہیں کرتا' تو ہم اسی پر محمول کریں گے کہ اس کو تصدیقِ قلبی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللسان ایمان کا جزو قرار دیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر اقرار کرنا اسی مقصد کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے' جو حضرت استاذ مرحوم کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے' تو پھر رکنیت اور شرطیت کا اختلاف بہت بڑھانا نہ چاہیے۔ بلکہ اب مناسب یہ ہے کہ اختلاف کی تنقیح یوں کر دی جائے کہ اقرار کرنا بالاتفاق ضروری ہے' مگر ایک فریق نے اس کی اہمیت زیادہ محسوس کرکے رکنیت کا لفظ کہہ دیا ہے' اور دوسری جماعت نے گو

اہمیت کو تسلیم کیا ہے مگر رکنیت کا لفظ نہیں کہا۔ پھر اگر پہلے فریق نے رکن کہا ہے' تو لفظ زائد کہہ کر اسے ذرا پھیکا بھی کردیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ یہاں ایک اور مفید تحقیق فرما گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقرار کے دو معنی آتے ہیں' زبان سے تصدیق کرنا اور التزامِ طاعت اور عہدِ عمل و فرمانبرداری۔ آیتِ ذیل میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ط قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ط قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط (آلِ عمران ۳:۸۱)

اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ سے عہد لیا کہ' جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم' پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو' تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا' کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا۔ وہ بولے' ہم نے اقرار کیا۔

اس آیت میں اقرار کا لفظ عہدِ عمل اور التزامِ طاعت ہی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ یہاں انبیاؑ سے کسی امر کی صرف تصدیق مطلوب نہیں' بلکہ اس کا عہد لیا جارہا ہے کہ جو رسول تمہارے پاس آئے گا تمہیں اس کی اطاعت کرنا ہوگی' اس پر ایمان لانا ہوگا' اس کی نصرت کرنی پڑے گی۔ التزامِ طاعت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اب اگر اقرار سے یہ معنی مراد لے لیے جائیں' تو ایمان کی تعریف میں صرف اقرار کی قید کافی ہوگی' ورنہ التزامِ طاعت کے تیسرے رکن کا اضافہ کرنا ضروری ہوگا۔

۱۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی ہی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے۔ اگر خدا کے رسول کے علم پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً منافقین کا گروہ' کفار میں شمار ہوتا۔ اب اگر ان کو قتل کیا جاتا تو انھیں ناحق یہ بدنام کرنے کا موقعہ ہاتھ آ جاتا کہ آپؐ اپنے اصحاب و رفقا کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لیے کلمۂ توحید کا زبانی اقرار ہی اسلام قبول کرنے کا معیار قرار دے دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کا دارومدار رکھ دیا گیا(کتاب الایمان' ص ۱۷۳)۔